سعید احمد اختر کی غزل میں موضوعاتی تنوع

ڈاکٹر حسین محمود
صدر شعبہ اُردو
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، کوہاٹ

THEMATIC VARIETY IN SAEED AHMAD AKHTAR'S GHAZAL

Husain Mahmood, PhD
Chairman Deptt. of Urdu
Govt.Post Graduate College, Kohat

Abstract

Saeed Ahmad Akhtar is one of the renowned contemporary poets of Urdu. He has published more than a dozen books on poetry. He has also composed in English. His verse especially ghazal is very rich in versatility and diversity of topics. He abided by the rules and norms of classical poetry as well as modern contemporary trends.At a glance; one can point to a gloomy atmosphere and deep sorrow in Akhtar's ghazals. But the fact is that he doesn't appreciate disappointment and despair; rather he keeps his journey towards better and brighter future.

Keywords:

اُردو، غزل، فلسفہ، غالب، سعید احمد اختر، خاور احمد، طارق ہاشمی

عام طور پر صوبہ خیبر پختونخواہ کے جنوبی اضلاع کوہاٹ، بنوں، لکی اور ڈیرہ اسماعیل خاں وغیرہ اپنی پس ماندگی کے لیے زیادہ مشہور ہیں لیکن کچھ دیگر میدانوں کی طرح ادب کے میدان میں بھی اِن علاقوں سے ایسی ہستیاں سامنے آئیں ہیں جنھوں نے تاریخِ ادب میں ایک معتبر مقام حاصل کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کا علاقہ ادبی میدان میں اپنی ایک پہچان رکھتا ہے۔ یہاں سے عطاء اللہ خاں عطاؔ گنڈاپور (۱۸۹۸۔۱۹۹۱ء) جیسے فارسی واُردو کے شاعر وادیب سے لے کر سعید احمد اخترؔ (۱۹۳۳۔۲۰۱۳ء)، غلام محمد قاصرؔ (۱۹۴۴۔۱۹۹۹ء)، خاورؔ احمد (۱۹۵۵ء)، جمشید نایابؔ اور ڈاکٹر طارق ہاشمی (۱۹۷۰ء) تک پوری ایک کہکشاں ہے جس میں شامل شعرا نے تخلیقی سطح پر اپنی اہمیت تسلیم کرائی ہے۔ اِس کہکشاں میں کچھ نام ایسے بھی ہیں جو صرف تخلیقِ شعر کے ضمن میں ہی اہم نہیں بل کہ نقدِ شعر کے لیے بھی معروف رہے ہیں۔ غلام محمد قاصرؔ اور ڈاکٹر طارق ہاشمی اِس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ اِن شعرا ہی میں سے ایک نام سعید احمد اخترؔ کا ہے جو ملک کے بزرگ ترین شعرا میں سے ایک تھے اور جن کی عمر کا اکثر حصہ تخلیقِ شعر کے عمل میں گزرا۔

اخترؔ کی پیدائش تو بلوچستان کے علاقے پشین کی ہے لیکن اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ ڈیرہ اسماعیل خاں میں گزرا، جہاں اُن کے آباواجداد آکر آباد ہو گئے تھے۔ سعید احمد اخترؔ نے ابتدائی زندگی کوئٹہ میں گزاری۔ میٹرک ۱۹۴۷ء میں اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ سے پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں ایف اے درجۂ اول میں جب کہ ۱۹۵۶ء میں پرائیوٹ اُمیدوار کی حیثیت سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۸ء میں پشاور یونیورسٹی سے باقاعدہ طالب علم کے طور پر ایم اے انگریزی کیا۔ وہاں اُن کے دیگر ہم جماعت مشہور ادیب قلندر مومند، مقبول الرحمٰن اور مسکین حجازی وغیرہ تھے۔ ایم اے کے بعد کچھ عرصہ تک انگریزی ادبیات کے اُستاد بھی رہے بعد میں مقابلے کے امتحان میں نمایاں کام یابی حاصل کی اور جنوبی وزیرستان میں ایک انتظامی عہدے پر فائز ہو گئے۔ اِس کے بعد مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر اور دیگر کئی اہم عہدوں پر متمکن رہے۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۰ء تک افغان مہاجرین میں ایڈیشنل کمشنر ریلیف کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۹۰ء میں قبل از وقت اپنی مرضی سے سبک دوش ہو گئے۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے شعر و شاعری سے دِل چسپی رہی اور تعلیم کے ساتھ ساتھ شعر و سُخن کی مشق بھی جاری رکھی۔ ایک درجن سے زائد شعری مجموعے تخلیق کیے۔ کئی زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن اُردو اور انگریزی کی شاعری کے لیے زیادہ معروف رہے۔ اُردو شعری مجموعوں کے نام یہ ہیں: **دیارِ شب، سطحِ آب، چاندنی کے سائے، خواب نگینے، لے گئی پَوَن اُڑا، ورشا نجلی، پتہ ٹوٹا ڈال سے اور اب کے بچھڑے کب ملیں** وغیرہ وغیرہ۔

اختر نے بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن اُن کی غزل زیادہ توانا اور مستحکم ہے۔ وہ ایک بڑے قادر الکلام غزل گو شاعر کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔ اُن کی پُختہ کاری اور تازہ کاری اُن کی غزل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اُن کے ہاں غزل میں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ اُنھیں ایک اہم غزل گو کا مقام دلانے کے لیے کافی ہے۔ وہ کلاسیکی غزل کی روایت کے امین بھی ہیں اور جدت پسند بھی۔ اُن کی تنوع پسندی قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور اُسے یک گونہ سرشاری و لُطف و انبساط فراہم کرتی ہے۔

اُردو غزل کا غالب ترین و اہم ترین موضوع وہ ہے جو حُسن و عشق اور رومان سے عبارت ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اُردو غزل کی بنیاد ہی اِس موضوع پر قائم ہے اور یہ اِس کے لیے خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اختر کی غزل میں بھی یہ موضوع بڑا نمایاں اور غالب رہا ہے۔ اُن کی غزل کی جڑیں کلاسیکی روایتِ غزل میں پیوست ہیں لہٰذا اِس موضوع کو اُنھوں نے بہت خوب صورتی سے برتنے کی کوشش کی ہے:

خیالِ برق ہے نے فکرِ آب و دانہ ہے
کہ تیرے پیار سے آباد آشیانہ ہے
غروب ہوتے ہوئے رُک گیا ہے کیوں سورج
فرازِ کوہ پہ کس بُت کا آستانہ ہے
تری اداؤں کی نیت ہزار پاک سہی
تری نگاہ کا انداز مجرمانہ ہے(۱)

اخترؔ کی غزل میں جذبۂ محبت سے وابستہ کیفیات و احساسات کا بیان و اظہار بڑا عام ہے اور اِس کے نتیجے میں سامنے آنے والی نارسائی کے دُکھ، احساسِ زخم خوردگی اور احساسِ تنہائی وغیرہ سبھی کا ذکر بہت نمایاں ہے۔ نارسائیوں اور تنہائیوں کے یہ دُکھ ایک دوسرے سے باہم مل کر درد و غم کے معتبر حوالوں کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں اور ذہن و قلب پر اپنے نشان مرتسم کرتے ہیں:

آنکھ تو رنگِ بہاراں میں بہک جائے گی
دل سے کیسے ترے پہلو کی مہک جائے گی
دُھوپ چاہو گے تو دیوار کا سایہ ہو گا
چھاؤں ڈھونڈو گے تو دیوار سرک جائے گی(۲)

احساسِ تنہائی اور نارسائی سے جنم لینے والی یہ اُداسی و افسردگی اور کرب و ملال شاعر کو دل برداشتہ نہیں کرتے بل کہ آرام و سکون کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ شاعر دُکھ درد کا عادی ہو کر اُسے اپنے لیے ایک خزانہ تصور کر لیتا ہے، اِس کے حصار میں رہ کر وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور آنسوؤں کی جھڑی میں قہقہے لگاتا نظر آتا ہے:

کھینچ لایا ہے کُنجِ تنہا میں
غم تو آرام کا خزانہ ہے(۳)
کام کا وقت مقرر ہے نہ تعطیل کا دن
غم کا دفتر ہے یہ دن رات کھلا رہتا ہے(۴)
درد ہوتا ہے خُدا جانے کہ دل ہوتا ہے
کچھ تو ہر کام میں رہ رہ کے مخل ہوتا ہے(۵)

اخترؔ کی غزل میں داستانِ محبت کے ساتھ ساتھ دُکھ کی یہ لہر بھی چلتی محسوس ہوتی ہے اور یہی اُداسی وافسردگی اُن کی محبت کی خاص پہچان بن جاتی ہے۔ حمایت علی شاعرؔ اِس کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> یہ دُکھا دُکھا لہجہ، یہ بُجھا بُجھا جذبہ جس میں چنگاریاں سی سلگتی رہتی ہیں اور درد کی ایک دھیمی دھیمی لہر جو اشعار کی فضا میں سسکیاں سی بھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، سعید اخترؔ کی محبت کی خاص پہچان ہے۔(۶)

اخترؔ کی غزل میں درد و غم کی یہ لے پھیل کر ذاتی حدود سے نکل کر آفاقی شکل اختیار کر لیتی ہے۔اُن کے رومانوی طرزِ فکر، احساسِ زخم خوردگی، احساسِ نارسائی، کربِ تنہائی اور مزاج کی غم آگیں کیفیت کے تانے بانے آپس میں مل کر تغزل کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔اُن کے لہجے میں درد سمٹ کر آجاتا ہے اور غنائیت کی مدھر لے قاری کو عالمِ کرب میں محو کر لیتی ہے:

شب کو جب بحر سا یادوں کا سماں ہوتا ہے
دل پہ ٹوٹی ہوئی کشتی کا گماں ہوتا ہے
خون بہتا ہے مگر زخم کہاں ہے جانے
درد ہوتا ہے مگر جانے کہاں ہوتا ہے(۷)

غزل کے علائم و رموز سے آگہی کی یہ دولت وہ اُس کے مخصوص لب و لہجے اور لوچ کا خاص خیال رکھتے ہیں اور عشق و رومان کے دل دوز تذکرے کے دوران ایک سوگوار فضا تخلیق کرنے کا پورا اہتمام کرنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔

اخترؔ اگرچہ صُوفی نہیں تھے اور انھیں مذہب سے بھی زیادہ شغف نہیں تھا۔ وہ صرف ''انسانیت'' کو مذہب مانتے تھے،تاہم ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است'' کے مصداق اُردو غزل کی روایت کے تحت کچھ شعر ایسے بھی کہے ہیں جو متصوفانہ رنگ کے حامل ہیں اور صرف اُن تک ہی یہ بات محدود نہیں ہے، بل کہ تقریباً ہر اہم شاعر نے ایسا کیا ہے۔ بھلے ہی وہ عملی طور پر صُوفی نہ ہو۔اخترؔ کی غزل میں کئی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو حرم زئی سیدوں کے ساتھ اُن کے بیتے بچپن، اُن کی گوشہ گیری، درویش منشی اور فارسی ادب کی مستحکم روایت کی طرف اُن کے میلانِ طبع کا پتا دیتے ہیں:

دھڑکنیں بس ایک ہی آواز ہیں
تو کہاں ہے تو کہاں ہے تو کہاں(۸)
مخفی ہے جیسے رنگ چُھپے روشنی میں ہوں
سو ذکر گرچہ تیرا مری داستاں میں ہے(۹)
تیری محفل میں ترے کُوچے میں تیرے دَر پر
آ کے بیٹھا ہے جو اک بار کہاں اُٹھتا ہے(۱۰)

پھول ہیں رنگ ہیں یا خوشبو کے دھارے ہیں
پیارے پیارے سارے نام تمھارے ہیں(۱۱)

مسئلہ جبر و قدر غزل کا ایک اہم موضوع رہا ہے جس کی بنیاد یہ سوال ہے کہ آیا انسان اپنے افعال و اعمال اور ارادوں میں مجبور ہے یا خود مختار اور آزاد ؟یوں دو بڑے گروہ بن جاتے ہیں یعنی جبریہ اور قدریہ۔ شعرائے کرام اِن میں سے کسی ایک یا بعض اوقات دونوں کی تائید کرتے ہیں۔اختؔر کی غزل میں کئی ایسے اشعار دیکھے جا سکتے ہیں جن سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن کے دریچے بھی جبریت کی طرف کُھلتے ہیں اور یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے تمام مظاہرِ فطرت جبر کی کسی نہ کسی زنجیر میں مقید ہیں۔ جبریت کے مختلف پہلو اور کیفیتیں اختؔر کی غزل میں دیکھی جا سکتی ہیں:

تارے ازل سے رات کی کالی گھپاؤں میں
گرداں ہیں لے کے جبر کی زنجیر پاؤں میں(۱۲)
لاکھ ہم لوگوں نے دیواروں سے سر ٹکرائے
چیخ باہر نہ مگر گنبدِ بے در سے گئی(۱۳)
اے رات کے زندان سے بھاگے ہوئے لوگو !
دن بھی تو اِسی بندِ سلاسل کی کڑی ہے(۱۴)

اختؔر کی غزل فلسفۂ حرکت و عمل کے عنصر سے مملو ہے اور ترقی پسندانہ سوچ کے جذبے سے بھی۔ وہ نسلِ نو کو جبر کے آگے سرنگوں ہونے کا نہیں بل کہ اُس کے خلاف صف آرا اور نبرد آزما ہونے کا درس دیتی ہے۔ اختؔر اِس خیال کے قائل ہیں کہ جہاں معاشرے میں کاہلی اور تن آسانی کا زہر سرایت کر جائے وہاں نسلیں بے دست و پا اور مجبور و مقہور ہو جایا کرتی ہیں۔ سو وہ ذہنوں کو انقلاب آشنا ہونے پر اُکسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لوگوں کو دورِ حاضر میں پیش آنے والے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے پر راغب کرتے ہیں اور بہ طور شاعر اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں:

تقدیر کے گنبد میں نہ دَر ہے نہ دریچہ
اصلاحِ قفس کے لیے آواز اُٹھاؤ(۱۵)
اِس ایک سے دھرتی کے اندھیرے نہیں مٹتے
ممکن ہو تو سورج یہاں کچھ اور جلا دے(۱۶)

ہم اِس سلیقے سے بزم جہاں سجائیں گے
اندھیرے چاند سمندر میں ڈوب جائیں گے(۱۷)
شکستہ پا ہو تو کیا قافلے میں شامل ہو
پڑے رہو کوئی مشعل جلا کے رستے میں(۱۸)

اختؔر جب ترقی پسندانہ سوچ کی ترغیب دیتے ہیں تو وہ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو روشنی کی قوت سے ختم کرنے کی بات کرتے ہیں یا اگر کبھی انقلاب کا درس دیتے ہیں تو ایسی صورت میں بھی اُن کے شعر، شعر ہی رہتے ہیں، و گرنہ اکثر شعرا ایسے موقعوں پر نعرہ بازی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جہاں شعر نعرہ بن گیا وہاں تاثیر کا عنصر عنقا ہو گیا، شعریت کا خون ہو گیا اور نتیجتاً تخلیقی لُطف غارت ہو گیا۔ اختؔر کے ہاں ایسا نہیں۔ وہ شعر کے حُسن پر کسی صورت مصلحت سے کام نہیں لیتے اور شعر کو شعر ہی رہنے دیتے ہیں۔ غلام محمد قاصرؔ ''دیارِ شب'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> اُن (سعید احمد اختؔر) کے یہاں حالات کو بدلنے کی ایسی شدید تڑپ ملتی ہے جو ترقی پسندانہ افکار و خیالات سے اُن کی ذہنی اور جذباتی کمٹمنٹ کا بین ثبوت ہے۔ تاہم اُن کے شعر دلوں کو ایک ولولۂ تازہ دینے کے باوجود شعر ہی رہتے ہیں۔ کسی ناصح کا پند نامہ یا جذبۂ اصلاح سے چُور کسی لیڈر کے کھوکھلے نعرے نہیں بنتے۔(۱۹)

اختؔر حالات کے جبر سے باخبر ضرور ہیں لیکن کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ وہ ایک رجائیت پسند شاعر کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔ وہ زندگی کو ہمیشہ روشن زاویے سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ نامساعد حالات اور ابتر صورتِ حال سے آزردہ خاطر نہیں ہوتے۔ اُن کے ہاں یاسیت اور مایوسی نہیں بل کہ آس اور اُمید کے سائے ہر جگہ جلوہ فگن نظر آتے ہیں:

آنکھوں میں آرزو کے سویرے لیے ہوئے
میں شامِ زندگی سے بہت مطمئن ملا(۲۰)
کچھ تعلق جو نہ ہوتا تو خفا کیوں ہوتے
بے رُخی اُن کی محبت کا پتہ دیتی ہے(۲۱)

ترکِ تعلقات کی سرحد پہ آ کے بھی
مڑ مڑ کے دیکھتے ہیں ابھی نامہ بر کو ہم(۲۲)

اختؔر عصرِ حاضر کے تقاضوں سے با خبر ہیں۔ وہ ایک حساس فرد کی طرح اپنے ماحول اور معاشرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ اُنھیں مٹتی ہوئی اقدار کا دُکھ بھی ہے اور نسلِ نو کو در پیش ناگفتہ بہ حالات کا بے جگری سے اور بے باکانہ مقابلہ کرنے کی آرزو کی آس بھی۔ فی زمانہ کس مپرسی اور نفسا نفسی کے عالم کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، وہ اِس سے ناخوش ہیں۔ اُن کی غزل اِس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ یہ شاعر کا ذاتی غم نہیں بل کہ ایک معاشرتی اور سماجی و اجتماعی المیہ بھی ہے:

چکور خوش ہے کہ بچوں کو آ گیا اُڑنا
اُداس بھی ہے کہ رُت آ گئی بچھڑنے کی(۲۳)
جواں ہو گئے میرے بچے تو میں
بس اک بے اثر سی دُعا رہ گیا(۲۴)

اختؔر معاشرتی مسائل اور طرزِ زندگی کو بلا کم و کاست بیان کرتے ہیں اور جہاں خرابی نظر آتی ہے وہاں گہری طنز بھی کرتے ہیں اور سماجی المیہ کی نشان دہی بھی کرتے ہیں:

مل گیا ہے وہی ماحول ہمیں گھر بیٹھے
بڑی خواہش تھی کہ رہتے کبھی بیگانوں میں(۲۵)

اختؔر کی غزل کلاسیکی روایات کی امین ہے اور عصرِ نو کی نمائندہ بھی۔ آزادی کے بعد جدید اُردو غزل جن علائم و رموز سے آشنا ہوئی وہ اُن کی غزل میں نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید (۱۹۲۸۔۲۰۱۶ء) اِس بارے میں لکھتے ہیں:

> آزادی کے بعد اُردو غزل نے جو جدید رُوپ اختیار کیا اُس میں نئے علائم و رموز کو اِرد گرد کے ماحول کی عکاسی کے لیے بہ طورِ خاص استعمال کیا گیا۔ موضوعات کے انتخاب میں عصرِ نو میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو ترجیح دی گئی اور جذبہ و تاثر کی مقامیت کو استعمال میں لایا گیا۔ یہ ایک بڑی

انقلابی تبدیلی تھی جس نے غزل کی ہیئت کو تو قائم رکھا لیکن اِس کے داخل میں نیا خون شامل کر دیا۔(۲۶)

جدت کا یہ رُجحان اختؔر کی غزل میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن کے ہاں غزل میں موضوعات کی ایک پوری کہکشاں آباد ہے۔ وہ معاشی مسائل کا تذکرہ بھی کرتے ہیں، انسان دوستی اور وطن دوستی کے گیت بھی گاتے ہیں، اُن کی غزل میں ایک انتظاری کیفیت بھی نمایاں ہے اور قبائلی رسوم و روایات کی عکاسی، دیہاتی پن اور مقامیت کا عنصر بھی واضح طور پر جھلکتا ہے۔ وہ غزل اور تغزل کے لوازمات کو ہمہ دَم مقدم رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں لہجے میں اعتدال کی جو کیفیت اور توازن ہے وہ بہت کم شاعروں کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وہ شعر کہتے ہوئے اپنے ''ہوش و حواس'' قائم رکھتے ہیں اور جذبات پر قابو رکھنے کے فن سے کماحقہ آگاہ ہیں۔ کسی شاعر کے لیے شعر کہتے وقت اِن تمام باتوں کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ شعری نزاکتوں اور فنی موشگافیوں سے بے اعتنائی برتنے کے نتیجے میں شعریت متأثر ہوتی ہے اور لطف سُخن غارت ہو جاتا ہے۔ اختؔر اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کلاسیکی روایات کی پابندی کرتے ہوئے جدید دَور کے تقاضوں اور اُمنگوں سے ہم آہنگ ہو کر غزل کہتے ہیں۔ یوں وہ عصرِ حاضر کے اہم ترین غزل گو شعرا میں شمار کیے جانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سعید احمد اختؔر، پتہ ٹوٹا ڈال سے (لاہور: فطرت پبلی کیشنز اظہار سنز، ۱۹۸۸ء)، ۷۸۔

(۲) ایضاً، دیارِ شب (لاہور: مکتبۂ فنون، بارِ اول ۱۹۷۶ء)، ۵۳۔

(۳) ایضاً، پتہ ٹوٹا ڈال سے (لاہور: فطرت پبلی کیشنز اظہار سنز، ۱۹۸۸ء)، ۴۹۹۔

(۴) ایضاً، سطحِ آب (لاہور: فنون پریس، بارِ اول ستمبر ۱۹۷۶ء)، ۳۲۔

(۵) ایضاً، پتہ ٹوٹا ڈال سے (لاہور: فطرت پبلی کیشنز اظہار سنز، ۱۹۸۸ء)، ۵۱۔

(۶) حمایت علی شاعرؔ، شخص و عکس (کراچی: المصنفین، سی بی الفلاح سوسائٹی ۱۹۸۴ء)، ۱۱۹۔

(۷) سعید احمد اختؔر، سطحِ آب (لاہور: فنون پریس، بارِ اول ستمبر ۱۹۷۶ء)، ۱۷۔

(۸) ایضاً، بحوالہ بالا، ۵۸۔

(۹) ایضاً، بحوالہ بالا، ۶۲۔

(۱۰) ایضاً، بحوالہ بالا، ۷۹۔

(۱۱) ایضاً، ورشانجلی،(لاہور: شاہراہ پبلی کیشنز اُردو بازار، فروری ۲۰۰۲ء)،۳۱۔

(۱۲) ایضاً، سطحِ آب (لاہور: فنون پریس، بارِ اول ستمبر ۱۹۷۶ء)،۱۳۔

(۱۳) ایضاً، دیارِ شب (لاہور: مکتبۂ فنون، بارِ اول۱۹۷۶ء)،۳۰۔

(۱۴) ایضاً بحوالہ بالا،۳۳۔

(۱۵) ایضاً بحوالہ بالا،۴۷۔

(۱۶) ایضاً بحوالہ بالا،۸۵۔

(۱۷) ایضاً،ورشانجلی،(لاہور: شاہراہ پبلی کیشنز اُردو بازار، فروری ۲۰۰۲ء)،۱۲۱۔

(۱۸) ایضاً،پتہ ٹوٹا ڈال سے،(لاہور: فطرت پبلی کیشنز اظہار سنز،۱۹۸۸ء)،۲۱۶۔

(۱۹) غلام محمد قاصرؔ،دیباچہ،دیارِ شب،۱۶۔

(۲۰) سعید احمد اخترؔ،خوابگینے (کراچی: المصنفین، سی بی الفلاح سوسائٹی،۱۹۸۳ء)،۱۸۹۔

(۲۱) ایضاً،دیارِ شب (لاہور: مکتبۂ فنون، بارِ اول۱۹۷۶ء)،۱۱۵۔

(۲۲) ایضاً،پتہ ٹوٹا ڈال سے (لاہور: فطرت پبلی کیشنز اظہار سنز،۱۹۸۸ء)،۲۱۴۔

(۲۳) ایضاً،سطحِ آب (لاہور: فنون پریس، بارِ اول ستمبر ۱۹۷۶ء)،۵۹۔

(۲۴) ایضاً بحوالہ بالا،۸۳۔

(۲۵) ایضاً،خوابگینے (کراچی: المصنفین، سی بی الفلاح سوسائٹی،۱۹۸۳ء)،۳۸۔

(۲۶) انور سدید،اُردو ادب کی مختصر تاریخ (لاہور: اے ایچ پبلشرز الفضل مارکیٹ اُردو بازار، طبع اول اپریل۱۹۹۶ء)،۴۶۷۔

❖ ❖ ❖